ĪQĀN- Vol: 03, Issue: 02, Jun-2021
DOI: 10.36755/iqan.532.2021- PP: 77-88

OPEN ACCESS
ĪQĀN
pISSN: 2617-3336
eISSN: 2617-3700
www.iqan.com.pk

زبانوں کے پھیلاو میں مذہب بحیثیت عامل: لاطینی، سنسکرت اور عربی کے تناظر میں مطالعہ

Religion as a Factor in Spreading of Languages: Studies in the Context of Latin, Sanskrit and Arabic

***Fatima Bibi,** < fatima.jalal@ue.edu.pk >
Ph.D. Scholar, Department of Urdu,
Government College Women University, Faisalabad, Pakistan.
****Dr. Shahida Yusuf,** < drsyusuf8@gmail.com >
Associate Professor, Department of Urdu,
Government College Women University, Faisalabad, Pakistan.

Version of Record
Received: 19-Mar-21; **Accepted**: 01-Jun-21; **Online/Print**: 30-Jun-21

ABSTRACT

Expansion of a language is a continuous process. To understand the spread of a language, we have to travel from one region to another and from one era to another. We have to take care of even the smallest detail during this journey while traveling in the realm of time and space. Here's nothing useless, futile, or absurd. Many precious ideas can be derived from the absurdities of cultural and so-called religious phenomena. In such a way, we can be able to understand the manners and methodology of the expansion of a language or some certain languages. In this article too, an attempt has been made to review how religion plays a vital role and has a far-reaching effect in the perspective of Latin, Sanskrit, and Arabic language through an interdisciplinary study such as sociology, anthropology, philosophy, and history.

Keywords: *Religious Factor, Languages, Latin, Sanskrit, Arabic.*

تعارف:

زبان کا ارتقا ایک فطری عمل ہے۔ دنیا کی ہر زبان تبدیلی کے عمل سے گزرتی رہتی ہے۔ ماہرین اسے زبان کے فطری ارتقا کا نام دیتے ہیں۔ دنیا کی ہر زبان میں وقت کے ساتھ ساتھ بہت سے نئے الفاظ داخل ہوتے رہتے ہیں اور اسی طرح بہت سے الفاظ جو وقت کی کسوٹی پر پورے نہیں اترتے متروک ہوتے چلے جاتے ہیں۔ دراصل کسی بھی زبان میں الفاظ کے داخل یا خارج ہونے کے اس عمل میں مختلف لسانی گروہوں کے فصل و وصل کا بہت بڑا کردار ہوا کرتا ہے۔ اس فصل و وصل کے نتیجے میں نئے الفاظ زبان میں شامل

CC BY

ہوتے رہتے ہیں اور وہ الفاظ جو نئے لسانی گروہوں کی لسانی عادات اور عضویاتی ساخت سے مطابقت نہیں رکھتے، ترک کر دیے جاتے ہیں۔ جیسے ہندوستان کے اطراف واکناف سے ہجرت کرکے پاکستان آنے والے افراد جب مختلف ثقافتوں (پنجابی، سندھی، پختون، بلوچ اور سرائیکی وغیرہ) کا حصہ بنے تو ان ثقافتوں کے زیر اثر مختلف قسم کے ملبوسات، کھانوں، برتنوں اور ضروری استعمال کی اشیاء کے ناموں کے علاوہ بے شمار قسم کے مذہبی اور ثقافتی رسوم ورواج اور عام بول چال میں استعمال ہونے والے الفاظ بھی اردو زبان کا حصہ بنتے چلے گئے۔ اس طرح دو مختلف ثقافتوں اور زبانوں کے میل جول سے نئی ثقافت اور زبان کے خدوخال ابھر کر سامنے آئے مختلف زبانوں اور ثقافتوں کے میل جول کا یہ عمل پاکستان کی جغرافیائی حدود میں واقع ہر ثقافتی دائرے اور ہر لسانی ضابطے میں رونما ہوتا رہا جس سے اردو زبان کے مختلف الالوان لہجے اور لسانی ساختیں Patterns وجود میں آگئے۔ اردو زبان کے لفظوں اور لہجوں کا یہ تغیر و تبدل ایک فطری عمل تھا کیوں کہ مختلف لسانی گروہوں کے تعامل (Interaction) کے نتیجے میں کسی زبان کے صرف الفاظ ہی نہیں بدلتے بل کہ لہجہ بھی تبدیل ہو جاتا ہے۔ اس سلسلے میں محی الدین قادری زور لکھتے ہیں:

> "یہ تبدیلی اکثر نتیجہ ہوتی ہے ہمسایہ زبان کے اثر کا۔ بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ جب کسی قوم کی ایک نسل کو ایک اجنبی زبان بولنے والوں سے سابقہ پڑتا ہے تو اس اجنبی زبان کی آوازیں اس نسل کے اپنے لفظوں پر جو عمل اور رد عمل کرتی رہتی ہیں اس کے نتیجے کے طور پر اس تمام نسل کے مخارج لفظ آہستہ آہستہ اپنی جگہوں سے ہٹنے لگتے ہیں۔"[1]

یہی وجہ ہے کہ پاکستان کے مختلف علاقوں میں آباد اردو کے اہل زبان خاندانوں کی بول چال میں واضح فرق دیکھا جا سکتا ہے۔ ان کا الفاظ کا استعمال، روز مرہ اور محاورہ ہی نہیں لب ولہجہ بھی مقامی زبانوں سے متاثر نظر آتا ہے۔ پشاور میں آباد اردو کے اہل زبان افراد یا پنجاب اور سندھ میں آباد ان کے منقسم خاندان کے دیگر افراد کی بول چال کا جائزہ لیا جائے تو اِن سب اردو بولنے والوں پر اپنے اپنے رہائشی علاقوں کے مقامی باشندے ہونے کا گمان گزرے گا جو کہ ایک فطری امر ہے۔ اگر اردو نے مقامی زبانوں کے اثرات کو قبول کیا ہے تو مقامی زبانیں بھی اردو کے اثر سے آزاد رہنے کا دعوی نہیں کر سکتیں۔ لہٰذا اِن حالات میں کسی کا اپنی زبان کو خالص یا شدھ رکھنے پر اصرار ایک غیر فطری امر ہوگا۔

زبانوں کا ارتقا ایک دو طرفہ عمل ہے۔ ہر زبان جہاں دوسری زبانوں سے اخذ واستفادہ کرتی ہے وہاں دوسری زبانیں بھی اس کے اثرات کو قبول کرتی ہیں۔ جیسے ہندوستان میں فارسی نے جہاں دوسری زبانوں پر اپنا اثر ڈالا وہاں خود بھی مقامی زبانوں کے اثرات سے محفوظ نہ رہ سکی۔ اسی لیے اہل فارس کو ہندوستان میں لکھی اور بولی جانے والی فارسی کے لیے سَبکِ ہندی کی اصطلاح وضع کرنی پڑی۔ حالانکہ ہندوستان میں اہم فارسی گو شعرا کلیم کاشانی، شوکت بخاری، نظیری نیشاپوری، عرفی شیرازی، صائب تبریزی، وحید قزوینی، طالب آملی اور صابر کرمانی کا تعلق ایران ہی کے مختلف شہروں سے تھا۔ گویا فارسی کے اہلِ زبان ہونے کے باوجود یہ شعرا مقامی زبان اور ثقافت کے اثرات سے خود کو نہ بچا سکے۔

یہ جدلیاتی صورت حال صرف فارسی ہی کے ساتھ نہیں بل کہ دنیا کی ہر بڑی زبان کے ساتھ ماضی میں بھی پیش آتی رہی ہے اور اب تک جاری ہے۔ دراصل جس طرح ہر علاقے کے باشندے کچھ مشترک خصوصیات کے ساتھ ساتھ منفرد خدوخال کے مالک ہوا کرتے

ہیں ایسے ہی جب ایک زبان مختلف علاقوں میں بولی جاتی ہے تو ہر علاقے کی مقامی زبان کے اثر سے اس میں کچھ مخصوص امتیازات پیدا ہو جاتے ہیں جو اسے اپنی دوسری ہمسایہ زبانوں سے الگ اور ایک منفرد شناخت عطا کرتے ہیں۔ جیسے انگریز بطور Colonizer دنیا میں جہاں بھی گئے انھوں نے اپنی تہذیب و ثقافت اور زبان وادب سے وہاں کے عوام اور Intelligentsia کو شدید طور پر متاثر کیا لیکن اپنے زبان و ادب کو ان علاقوں کے مخصوص لسانی رویوں کے اثرات سے نہ بچا سکے۔اسی لیے انگریزوں کو Queen's English کی امتیازی حیثیت برقرار رکھنے کے لیے ,Australian English , African Indian English English اور American English جیسی اصطلاحات وضع کرنی پڑیں۔

عربی بھی عسکری قوت , تجارت اور تبلیغ دین کی کاوشوں کے نتیجے میں دنیا کے ایک بڑے علاقے پر اثر انداز ہونے کی صلاحیت رکھنے والی زبان تھی۔ شبلی نعمانی عباسیوں کے دور حکومت کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ :

> ''اس عہد میں حدود اسلامی کا دائرہ اس قدر وسیع ہو گیا تھا کہ ہندو کابل و ایران و ترکستان و شام و ایشیائے کوچک و اسپین اور تمام افریقہ اس میں داخل تھا''[2]

جزیرہ نمائے عرب کے سوامذ کورہ بالا تمام علاقے اپنی مخصوص تہذیب و ثقافت اور زبان وادب کے حوالے سے منفرد شناخت کے مالک تھے لیکن جب اہل عرب اپنی عسکری قوت کے زور پر یا تجارت اور تبلیغ کی غرض سے ان علاقوں میں پہنچے تو مختلف عوامل کے نتیجے میں عربی زبان کو حد درجہ اثر و نفوذ کی صلاحیت حاصل ہو گئی اور یہ ان علاقوں کی سرکاری اور تصنیف و تالیف کی زبان سے آگے بڑھ کے عوام الناس کی عام بول چال کی زبان کا درجہ حاصل کر گئی۔یوں تو عربی کو تمام بلاد اسلامیہ میں یہ درجہ حاصل تھا لیکن یہ امر قابل ذکر ہے کہ ان تمام علاقوں کے عربی بولنے والوں نے اپنے اپنے لسانی امتیازات کو بہر حال برقرار رکھا۔مثلا مصر میں بولی جانے والی عربی زبان عام عربی زبان سے بہت مختلف ہے۔ مصری بولی میں اکثر "جیم" والے الفاظ "گاف" سے ادا کیے جاتے ہیں ویکیپیڈیا کے مطابق: "نہ صرف حروف بل کہ بہت سے ایسے الفاظ اور محاورے بھی یہاں کی عربی بولی میں موجود ہیں جو معیاری عربی میں نہیں پائے جاتے۔[3] تاہم یہ ایک خوش آیند امر ہے کہ مصر میں تعلیم و تعلم، علم وادب اور سرکاری و صحافتی سطح پر فصیح عربی کا استعمال کیا جاتا ہے۔

یہی حال شمالی افریقہ میں بولی جانے والی عربی کا ہے جہاں عربی نے افریقہ کے بربر قبائل کی زبان ہی نہیں تہذیب و ثقافت اور بود و باش تک بدل ڈالی وہاں خود عربی بھی ان زبانوں کے اثرات سے محفوظ نہ رہی۔اس طرح صرف افریقہ ہی میں عربی کے کئی لہجے اور بولیاں وجود میں آگئیں جن میں الجزائر کی عربی قابل ذکر ہے جسے الجزایری عربی Algerian Arabic یا "دزیریہ" کہا جاتا ہے۔

یہ اخذ واستفادہ اور رد و قبول کا عمل کئی دوسرے عوامل کے ساتھ مل کر کسی زبان کے لیے حیات بخش، تو کسی زبان کے لیے موت کا پیغام ثابت ہوتا ہے کیوں کہ یہ سب کچھ ایک آزادانہ ماحول میں انجام پاتا ہے اس لیے کسی زبان کے بارے میں قطعی طور پر کسی بھی قسم کی پیش گوئی کرنا مشکل ہے کیوں کہ یہ ممکن ہے کہ ایک زبان کسی دوسری زبان کے تمام یا بیشتر حیات بخش عناصر کو اپنے میں جذب کر لے اور دوسری زبان سے زیادہ ترقی کر جائے۔تاہم کچھ آثار و قرائن سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مستقبل میں کون سی زبان کیا حیثیت اختیار کر سکتی ہے۔ جیسا کہ مشہور انگریز ماہر لسانیات جان بیمز ہندوستان میں اردو کے امکانات کا جائزہ لیتے ہوئے کہتا ہے:

"اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہندی کی فارسی آمیز شکل ایک عام زبان کی حیثیت سے دریائے سندھ سے راج محل تک اور ہمالیہ سے بندھیاچل تک رائج ہو جائے گی اور اس کا اثر ہمسایہ زبانوں پر بھی ہوگا۔ مختصر یہ کہ جب صوبائی حلقہ بندیوں سے پیدا ہونے والی علیحدگی پسندی ختم ہو جائے گی اور ملک کے مختلف حصوں میں آمدورفت کی آزادیاں بڑھیں گی، اس وقت وہ واضح، آسان، لچکدار اور اظہار کی زبردست طاقت رکھنے والی اردو زبان جو آج بھی ہندوستان کے بیشتر حصوں کی لنگوا فرانکا (یعنی ملکی اور قومی زبان) ہے یہاں کی عام زبان بن جائے گی۔"[4]

آگے چل کر وہ مزید لکھتا ہے کہ:

"اس زبان کا مقدر ہے کہ یہ دنیائے ہند کی انگریزی بن جائے"[5]

کسی بھی زبان کے ارتقا میں تین عامل انتہائی اہمیت کے حامل رہے ہیں (۱) مذہبی عامل (۲) سیاسی عامل (۳) معاشی عامل۔ دنیا کی تمام ترقی یافتہ اور مقبول عام زبانوں میں انھیں تین عوامل کے مختلف پہلو اور ابعاد نظر آتے ہیں لیکن ان عوامل میں مذہبی عامل کو کئی اعتبار سے خصوصی اہمیت حاصل رہی ہے۔ اس لیے دیگر دو عوامل کی اہمیت کے باوجود ہم اس تحریر میں مذہبی عامل کو اپنا موضوعِ تحقیق بنائیں گے۔

کسی مذہب کی وسعت اور اس کا پھیلاؤ اس مذہب کے ماننے والوں کی زبان کی ترقی پر گہرے اثرات مرتب کرتا ہے۔ کسی مذہب کے ساتھ ساتھ اُس کے اولین پیروکاروں کی زبان بھی جغرافیائی حدوں کو پار کرتی ہوئی اپنے مولد و مسکن سے دور نکل جاتی رہی ہے جیسے جیسے اور جہاں جہاں اس مذہب کے نقوشِ قدم جاتے ہیں وہاں وہاں اس زبان کے اثرات پڑنے شروع ہو جاتے ہیں۔

اگر ہم مغربی زبانوں میں یونانی پر لاطینی زبان کے تفوق کے اسباب جاننا چاہیں تو بدیہی طور پر مذہبی عامل کے سوا کوئی عامل ایسا نظر نہیں آتا جو یونانی زبان پر لاطینی زبان کی فضیلت کا سبب بنتا۔ یہ بات سب جانتے ہیں کہ یونانی زبان ایک وسیع تاریخی اور علمی پس منظر رکھنے والی زبان تھی۔ دنیا کے ادب عالیہ میں یونانی زبان کو ہمیشہ سے خاص اہمیت حاصل رہی ہے۔ 1308ء تک یعنی دانتے کی شہرہ آفاق نظم "ڈیوائن کامیڈی" کی تخلیق تک لاطینی زبان کا کوئی وجود نہیں تھا جب کہ دانتے کی تصنیف سے دو ہزار سال سے بھی زاید عرصہ پہلے یونانی زبان میں ہومر کی ایلیڈ اور اوڈیسی جیسی رزمیہ نظمیں وجود میں آچکی تھیں۔ ابنِ حنیف اس حوالے سے رقم طراز ہیں کہ:

"قدیم ترین یونانی ادب کا تخلیقی عہد اب سے تین ہزار برس قبل سے لے کر 'ہومر' کے عہد یعنی اب سے کوئی پونے تین ہزار برس پہلے تک قرار پاتا ہے اور 'ہومر' کا عہد قدیم دور (ARCHAIC PERIOD) 1000 تا 750 ق م یا قبل از کلاسیکی دَور بنتا ہے۔[6]

ایک 'ہومر' (Homer) اور ہیسیاڈ (Hesiod) ہی نہیں ایسپ (Aesop)، سیفو (Sappho)' پنڈر (Pindar)، ایسکائیلس (Aeschylus)، اور سوفوکلیز (Sophocles) جیسے قد آور مصنفین کی متعدد شعری تصانیف منصہ ء شہود پر آ چکی تھیں۔ ابن حنیف اس حوالے سے رقم کرتے ہیں:

"یونانی ادب کا کلاسیکی دور (500 ق م تا 300 ق م) شروع ہو جاتا ہے اس زمانے میں کئی عظیم ترین غنائی شاعر، عظیم ترین المیہ ڈرامہ نگار اور عظیم ترین طربیہ شاعر یونان میں پیدا ہوئے۔[7]

لیکن ''ہر کمالے راز وال'' کے مصداق، یونانی تمدن آہستہ آہستہ قانون فطرت کے تحت فنون لطیفہ کی نزاکت اور ذہن کی زرخیزی کھو بیٹھا اور رومن جو ظلم، بربریت، ہر قسم کے فواحش اور خواہشاتِ نفسانی کے غلام تھے۔ تہذیب و تمدن کے علم بردار بنتے گئے۔ اگرچہ رومی تہذیب و تمدن کے ارتقامیں یونانی فکر و فلسفہ کا بڑا دخل ہے تاہم یہ مذہب ہی تھا جس نے قبائل میں بکھرے ہوئے رومیوں کو ایک شان دار سلطنت (Empire) کا مالک بنادیا۔ رابرٹ بریفالٹ اپنی کتاب 'تشکیل انسانیت' میں لکھتے ہیں:

> ''رومن سلطنت کی ساخت ایک بہت بڑا نمایندہ چھوڑ گئی تھی۔ یعنی مسیحی کلیساء جس کا یورپ ہمیشہ احسان مند رہے گا۔ یہ ایک بندھن تھا۔ دُنیا ٹوٹ پھوٹ کر جن بادشاہتوں اور علاقوں میں تقسیم ہو چکی تھی اُن سب کو اُس نے مسیحیت کے نظریاتی مجموعے کی شکل میں باندھ رکھا تھا[8]

1313ء میں شہنشاہ کونسٹنٹائن (Constantine) کے مشرف بہ مسیحیت ہونے کے دس سال بعد عیسائیت، رومن ایمپائر (Empire) کا سرکاری مذہب بن گئی اور وہ روم جہاں بقول رابرٹ بریفالٹ ''ہمبر سے لے کر سمندر کے کنارے تک ایک بھی ایسا پادری نہیں ملتا تھا جو دعاؤں کو اپنی مادری زبان میں سمجھا سکتا ہو یا لاطینی کے کسی آسان سے آسان فقرے کا ترجمہ کر سکتا ہو۔[9] جہاں لفظ ''کلرک'' سے عام طور پر پادری یا وہ شخص مراد ہوتا تھا جو معمولی پڑھنا لکھنا جانتا تھا۔ اس جہالت اور علمی پسماندگی کے باوجود یہ کلیساء ہی تھا جسے بقول رابرٹ بریفالٹ ''رومی تہذیب کے نمایندے کی حیثیت حاصل تھی اور وہ ایک پھیلتے ہوئے مذہب کے مخصوص اصرار اور اختیار و اقتدار کی بناپر رومی تہذیب کی روایات اس کے خیالات اُس کی زبان اور اُس عام فضا کو دوسروں پر مسلط کر سکتا تھا کیوں کہ وہ ایک معلم تہذیب کا فرض ادا کر رہا تھا۔[10] یہی وجہ ہے کہ روم اور اس کی زبان کو صدیوں تک یورپ کی تمام ریاستوں اور زبانوں پر تفوق حاصل رہا۔

دوسری قدیم ترین زبان سنسکرت کے پھیلاؤ کا سبب بھی یہی مذہبی عامل تھا۔ سنسکرت کی جغرافیائی حدود جنوب مشرقی ایشیا سے آگے افغانستان اور وسطِ ایشیاتک محیط تھیں۔ یہ زبان ''رگ وید'' (1500ق م تا 500ق م) کی تصنیف سے بھی بہت پہلے ہندوؤں کی رسمیاتی اور تقریباتی زبان کا درجہ رکھتی تھی یعنی اسے استعمال کرنے والوں کی اپنی زبان کچھ اور ہوا کرتی تھی لیکن تقریبات بالخصوص مذہبی تقریبات کے موقعے پر سنسکرت کا استعمال کیا جاتا تھا اس طرح سنسکرت کو ایک مقدس زبان (Holy Language) کا درجہ حاصل ہو گیا۔ پروفیسر نصیر احمد خاں اپنی تصنیف ''تاریخِ زبانِ اردو'' میں رقم فرماتے ہیں:

> ''رگ وید کے مختلف حصے، مختلف اوقات میں، مختلف مقاموں پر لکھے گئے۔ کہیں قندھار کا ذکر ہے تو کہیں سندھ اور کہیں جمنا کی وادی کا''[11]

یہ زبان چوں کہ ہندومت کے علاوہ بدھ ازم اور جین ازم کی بھی مذہبی زبان تھی اس لیے بدھ ازم اور جین ازم کے پھیلاؤ کے ساتھ ساتھ اس زبان کا دائرہ بھی وسیع ہوتا گیا اور سنسکرت مشرقِ بعید سے لے کر شمال میں تبت اور لداخ تک مذہبی طبقے کی زبان کا درجہ حاصل کر گئی۔ بھارت کی مذہبی تحریکات میں بودھ اور جین مذہب کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ان دونوں مذاہب نے وید مذہب کے اثرات کو قبول کیا۔ آہستہ آہستہ یہ زبان ان مذاہب کے شرفا (Elite Class) کی زبان بن گئی اور اپنے مذہبی تقدس کی بناپر سنسکرت کا اثر و نفوذ وسطِ ایشیاتک پھیل گیا۔ ہندومت کے قدیم ترین مقدس متون اور صحائف وید کہلاتے ہیں اور یہ بھی سنسکرت میں

لکھے گئے چوں کہ وید کے صحائف ہندوؤں کی روزمرہ زندگی میں رہنمائی کے لیے لکھے گئے تھے اس لیے ایک خاص طبقے میں اس زبان کو سیکھنے کا ذوق و شوق بڑھتا گیا۔ رامائین اور مہا بھارت اگرچہ طویل رزمیہ نظمیں ہیں تاہم ہندوازم میں انھیں بھی تقدس کا درجہ حاصل ہے۔ ابن حنیف اس کے بارے میں رقم طراز ہیں:

> ''بھارت میں اڑھائی ہزار سال یا سوا دو ہزار برس قبل کے لگ بھگ ایک اور سنسکرتی ادب تخلیق ہونا شروع ہوااور صدیوں تک ہوتا چلا گیا۔ یہ 'رزمیہ' ادب تھا اس میں 'رامائن' اور 'مہا بھارت' کی رزمیہ داستانیں (Epics) شامل ہیں، رامائن پچاس ہزار سطور یا مصرعوں پر (مشتمل ہے) اور مہا بھارت کی 220000 (دو لاکھ بیس ہزار) سطریں یا مصرعے ہیں۔[12]

سنسکرت کے شعرا اور ادبا کو درباری سرپرستی حاصل رہی۔ دربار سے وابستگی کی وجہ سے انھیں خوب پذیرائی ملی اور جس شاہی ماحول میں ان کی پرداخت ہوئی یہ اسی ماحول کا حصہ بن گئے۔ شاہی درباروں سے منسلک فن کاروں کی ذہنی آبیاری میں مذہبی عقاید کا بھی اہم کردار رہا ہے۔ کنشک اور گپتوں کے عہد میں سنسکرتی ادب کو خوب فروغ ملا۔ اسی زمانے میں بدھ اور جین سنسکرت کی طرف متوجہ ہوئے۔

> "گپتوں کے عہد میں ہندو عوام میں پرانوں کے مذہب کو مقبولیت حاصل تھی۔ گپت بادشاہوں میں سمدر گپت سنسکرت زبان کا عالم تھا۔ اس نے علما، شعرا، مصوروں، موسیقاروں اور بت تراشوں کی بہت عزت افزائی کی[13]

سنسکرت کے تمام ادبی اور شعری فن پاروں میں مذہبی عناصر پائے جاتے ہیں۔ سیاسی، معاشی اور فکری غرض ہر طرح کے نظام میں مذہب کو اولیت رہی جس کی وجہ سے مذہبی تصانیف میں اضافہ ہوا۔ اس طرح وید، ویدانگ، سمرتیاں، مہاکاویہ اور پران کے علاوہ لوک ادب میں بھی مذہب کو بالادستی حاصل رہی۔

پروفیسر نصیر احمد خان بیان کرتے ہیں:

> "لوک ادب میں بھی اسی قسم کی ٹکسالی زبان کا استعمال کرنے لگے یہ زبان بن سنور کر سنسکرت (شدھ) ہو گئی اور پھر اسی نام سے پکاری جانے لگی۔ مذہبی، علمی اور ادبی طبقوں میں یہ سمجھی اور بولی جاتی تھی۔ پانینی نے 300ق م میں اسی زبان کی قواعد لکھی ہے۔[14]

جہاں سنسکرت کے پھیلاؤ میں مذہبی عامل کو خصوصی اہمیت حاصل ہے وہاں برہمنوں اور خاص مذہبی طبقے کی اجارہ داری سنسکرت کے زوال کا سبب بنی ہندوؤں کے طبقاتی نظامِ زندگی میں چھوٹی ذات کے ہندوؤں (شودروں، دلت) کو ہر معاملے میں برہمنوں سے رہنمائی لینی پڑتی تھی۔ اس اجارہ داری نے سنسکرت اور عوام الناس کے درمیان ایک خلیج پیدا کر دی جو رفتہ رفتہ بڑھتی گئی اور بالآخر جنوب مشرقی ایشیا سے لے کر وسطِ ایشیا تک پھیلی ہوئی زبان اپنے ہی دیس میں اجنبی بن گئی اور وہ عامل جو اس زبان کے پھیلاؤ کا سبب بنا تھا مذہبی طبقے کی غلط حکمتِ عملی کی بنا پر اسے صرف عبادت گاہوں تک محدود کرنے کا سبب بن گیا۔ عین الحق فرید کوٹی لکھتے ہیں:

''اس برہمنی ذہنیت کے زیر اثر برصغیر کے شمالی حصے کی زبانوں نے شروع ہی سے دو مختلف صورتیں اختیار کر لیں: اول سنسکرت اور دوسری پراکرت۔ سنسکرت زیادہ تر مذہب اور ادب کی زبان تھی اس لیے اسے ہمیشہ مذہبی اور بالائی طبقے کی سرپرستی حاصل رہی۔[15]

پروفیسر نصیر احمد خان بھی سنسکرت کے زوال کے بارے میں اسی نقطہ ء نظر کے حامی ہیں:

''بعد میں سنسکرت کا رواج کم ہونے لگا اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ یہ پڑھے لکھے لوگوں کی زبان ہونے کی وجہ سے مذہب اور ادب کی زبان بن کر رہ گئی تھی۔[16]

لاطینی اور سنسکرت کی طرح عربی زبان کے پھیلاؤ میں مذہبی عامل کو بھی نمایاں بل کہ مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ قرآن پاک جو کہ اُس وقت کی خالص ترین زبان عربی میں نازل ہوا، اِس کا پڑھنا اور سننا بھی عبادت تھا۔ اسی لیے جب تک مسلمان فاتحین خلافت اسلامیہ کو توسیع دینے میں مصروف رہے تب تک عربی زبان کی جغرافیائی حدود میں بھی توسیع ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ خلافت فاروقی کے عہد میں جب ایران فتح ہوا تو ان مفتوحین میں قرآنِ حکیم کو پڑھنے سیکھنے اور اس کے مشکل مقامات کی تشریح کرنے کا شوق فزوں تر ہوتا چلا گیا۔ چنانچہ علامہ نیاز فتح پوری ''نگار'' کے سال نامے میں عربی زبان اور دیگر علومِ قرآنی کے فروغ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''دوسری قوموں کے اسلام لانے کے بعد مذہبی تفتیش و تحقیق کا ذوق پیدا ہو گیا تھا اور قرآن کی صحیح تعلیمات معلوم کرنے کی غرض سے نیز احادیث رسول ﷺ، عقاید اسلامی اور مسایلِ فقہی پر غور کرنے کے لیے عربی زبان کی ضرورت اور اہمیت جلد ہی محسوس کر لی گئی تھی۔[17]

یوں عربی (فارسی کے ہوتے ہوے) ایران کی علمی و ادبی زبان بن گئی اور ایران کے دور دراز علاقوں تک رسائی حاصل کر لی۔ محمد بن زکریا رازی جیسا فلسفہ و طب کا امام اور علمِ کیمیا گری کا ماہر؛ فخر الدین رازی جیسا متکلم اور امامِ فلسفہ؛ ابو سہل بن رستم کوہی جیسا ہئیت دان اور علمِ ریاضی کا ماہر، جس نے بغداد میں آسمان پر ستاروں کی نقل و حرکت، اُن کے مقامات اور رفتاریں جاننے کے لیے ایک جدید رصد خانہ (Observatory) تعمیر کروایا جس میں خود اپنے تیار کیے ہوئے آلاتِ رصد نصب کیے؛ عمر خیام جیسا علومِ طبیعی کا ماہر اور عظیم فلسفی؛ ابو نصر فارابی جیسا سو سے زیادہ تصانیف کا مصنف، یونانی علوم کا محقق، علومِ طبیہ کا ماہر اور علمِ موسیقی کا شناور؛ ابنِ مسکویہ جیسا نابغہ جو طب، منطق، ریاضیات، طبعیات، الٰہیات، اور علمِ کیمیا کے علاوہ فلسفہ ءِ اخلاق کا بہت بڑا عالم تھا اور ابنِ ہیثم جیسا مہندس اُس عظیم علمی کہکشاں کا حصہ تھا جس نے عربی زبان میں علم و حکمت کے ان گنت ثابت و سیار روشن کیے۔

فنِ تفسیر میں کمال حاصل کرنے کے لیے عربی زبان و ادب کی گہری واقفیت ضروری تھی اس کے باوجود ایران اور ترکستان سمیت دیگر عجمی علاقوں نے دنیائے اسلام کے کئی بڑے مفسرین پیدا کیے۔ علامہ نیاز فتح پوری لکھتے ہیں:

''اگر آپ تمام تفاسیر کی فہرست اپنے سامنے رکھیں تو معلوم ہو گا کہ اکثر کتبِ تفسیر کے مصنف عجمی النسل تھے۔ عربی زبان میں جتنی تفاسیر لکھی گئی ہیں ان میں طبری، زمخشری، رازی اور بیضاوی کی تفسیروں کو خاص اہمیت حاصل ہے۔[18]

فاتحین کے ساتھ ساتھ عربی کا دائرہ ایران سے آگے بڑھ کے ماوراالنہر اور وسطِ ایشیا تک جا پہنچا اسے محض اتفاق نہیں کہا جا سکتا کہ دنیائے اسلام کے کئی عظیم محدثین مثلاً امام بخاری، امام مسلم، امام ترمذی، امام نسائی، ابنِ ماجہ اور امام ابو داؤد کے علاوہ شیخ بو علی سینا جیسے حکما؛ ابوالفتح کوشک اور ابوریحان البیرونی، نصیر الدین طوسی اور علی بن محمد قوشجی جیسے ہئیت دان، ریاضی اور جغرافیے کے ماہر اور امام غزالی جیسے متکلم اور مجدّد کا تعلق بھی اسی علاقے سے تھا۔

قرآنِ حکیم نے وسطِ ایشیا کے لوگوں کے دلوں میں ایسے گھر کیا کہ چودہ سو سال گزرنے کے بعد بھی وہاں کا حفظِ قرآن کی روایت عام تھی۔ اِس دوران میں سوویت یونین اور سوشلزم کے ظالمانہ اور جابرانہ دور میں جب قرآنِ پاک کا رکھنا بھی جرم قرار دے دیا گیا اور کسی شخص کے باغی ہونے کے لیے عربی میں لکھی ہوئی کسی کتاب کا برآمد ہونا ہی کافی تھا، ان ناگفتہ بہ حالات میں بھی وسطِ ایشیا کے لوگوں نے انتہائی منظّم مگر خفیہ طور پر علومِ قرآنی کی تحصیل کا سلسلہ جاری رکھا جب کہ عربی نہ تو ان لوگوں کی مادری زبان تھی نہ عربی سے اُن کے سیاسی و معاشی مفادات وابستہ تھے یہ صرف مذہبی عامل ہی تھا جس نے عربی کو وسطِ ایشیا کے بہت سے علاقوں کی ثانوی زبان (Second Language) بنا دیا۔ اس طرح جلال الدین خوارزم شاہ کے دور میں مفتوحہ علاقوں میں اُس کی حکومت ختم ہو جانے کے باوجود عربی زبان کو سیکھنے اور اس کے ذریعے سے علومِ قرآنی کی تحصیل کا شغف جاری رہا۔

ابتداءً عربی زبان قرآن و حدیث اور ان سے متعلق دیگر علوم کی تحصیل کے ذریعے کے طور پر استعمال ہوتی رہی لیکن جیسے جیسے علم کا دائرہ وسیع ہوتا گیا دوسرے علوم میں بھی علما کا شغف بڑھتا گیا اور اس خطے نے دنیائے اسلام کو کئی ایسے نام ور ماہرینِ علم عطا کیے جن کا ڈنکا نہ صرف صدیوں تک بلادِ اسلامیہ میں بجتا رہا بل کہ بعد ازاں یورپ بھی نشاۃ الثانیہ کے بعد سترھویں، اٹھارویں صدی عیسوی تک ان کی ضیا پاشیوں سے مستنیر ہوتا رہا۔ محمد بن موسیٰ الخوارزمی جیسے ہئیت دان، فنِ ریاضی کے ماہر اور "علمِ جبر و مقابلہ" (الجبرا) کے بانی کا تعلق اسی علاقے سے تھا۔ ثروت صولت اپنی کتاب "ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ" میں لکھتے ہیں:

> ''محمد بن موسیٰ خوارزمی نے ریاضی، الجبرا اور علمِ فلکیات پر بڑی معیاری کتابیں لکھیں اور ان علوم میں نیا اضافہ کیا۔ یورپ والوں نے گنتی کے ہندسوں اور صفر کا استعمال ان ہی کی کتابوں سے سیکھا۔[19]

علامہ شبلی نعمانی 'المامون' میں لکھتے ہیں کہ:

> ''علمِ جبر و مقابلہ پر اسلام میں اول جو کتاب لکھی گئی وہ اسی عہد کے ایک مشہور عالم محمد بن موسیٰ خوارزمی نے مامون کی فرمایش سے لکھی، یہ تصنیف آج بھی موجودہ ہے اور اس قدر جامع و مرتب ہے کہ علمائے اسلام نے جبر و مقابلہ میں سینکڑوں نادر کتابیں لکھیں لیکن اصل مسائل میں اس سے زیادہ ترقی نہ کر سکے۔[20]

بات صرف علمائے اسلام تک محدود نہیں رہی بل کہ وقت کے ساتھ ساتھ چار دانگِ عالم میں پھیلتی چلی گئی۔ مولانا عبدالسلام ندوی نے الخوارزمی کے تذکرے میں شبلی نعمانی کی عبارت میں یہ جملہ ایزاد کیا ہے کہ: "اُس کا یہ 'جبر و مقابلہ' یورپ میں مع انگریزی ترجمہ کے چھپ گیا ہے۔[21]

جب کہ حقیقت یہ ہے کہ خوارزمی وسطِ ایشیا سے تعلق رکھنے والا وہ مسلمان سائنس دان تھا جس کا نام یورپ میں " The decimal number system"کے معانی میں آج تک گونج رہا ہے اور ثانوی درجے تک تعلیم حاصل کرنے والا صرف امریکہ اور یورپ کا نہیں بل کہ دنیا کا بچہ بچہ خوارزمی کے عطا کردہ اس سسٹم کو فزکس، ریاضی، انجنیرنگ اور کمپیوٹر سائنس ہی نہیں بل کہ انفارمیشن ٹیکنالوجی کے متعدد شعبوں میں استعمال کر رہا ہے۔آج دنیا میں "Algorithmic trading","Algorithmic bias","the Facebook Algorithm"اور"Algorithmic warfare" جیسی بے شمار اصطلاحات عصرِ حاضر کے جدید ترین علوم میں کثرت سے استعمال ہو رہی ہیں اوریوں زندگی کے تقریباً تمام شعبوں میں داخل ہو چکی ہیں۔ Marek kowalkiewiczلکھتا ہے:

> *The term Algorithm derives from the name of Muhammad ibn Musa al-Khwarizmi, a ninth-century Persian mathematician. His Latinized name, Algoritmi, meant" The decimal number system "and was used in this meaning for centuries. The modern notion of algorithm emerged in English in the nineteenth century and became more commonly used since the 1950s, triggered by the emergence of first commercially available computer.* [22]

جب عساکرِ اسلام نے رومن ایمپائر کا رخ کیا تو عربی زبان بھی ان کے جلو میں ایسے علاقوں تک جا پہنچی جو اپنی مخصوص لسانی عادات یا اعضائے تکلم کی مخصوص ساخت کی بناپر عربی الفاظ کی صحیح ادائیگی سے بھی قاصر تھے لیکن پھر تاریخ نے دیکھا کہ ان علاقوں نے کیسے کیسے محدثین، کیسے کیسے مفسرین اور کیسے کیسے تفقہ فی الدین رکھنے والے علما پیدا کیے۔خلافتِ فاروقی کے عہد میں فتح ہونے والے اور شمال مشرقی افریقہ کو مشرقِ وسطی اور جزیرہ نمائے عرب سے ملانے والے انتہائی اہم اور قدیم تہذیبی و ثقافتی شہر، مصر، کی فتح نے مسلمانوں پر افریقی علاقوں تک دینِ اسلام باالفاظ دیگر عربی کی ترسیل کی راہ ہموار کر دی۔یہ شہر اب تک مسلمانوں کا ایک اہم علمی اور مذہبی مرکز ہے۔یہاں موجود جامعۃالازہر ایک ہزار سال سے بھی زاید عرصے سے مسلمانانِ عالم کی رہنمائی کا فریضہ انجام دے رہی ہے۔فقہِ شافعی کے بنیاد گزار اامام محمد بن ادریس شافعی کا تعلق بھی مصر سے ہے جن کے مقلدین مصر کے علاوہ جزائر شرق الہند، مشرقی افریقہ اور شام تک پھیلے ہوئے ہیں۔فن الجرح التعدیل کے ماہر اور 'طبقات الحفاظ' کے مصنف جلال الدین سیوطی کا تعلق بھی مصر سے تھا اور 'الاصابہ' جو کہ فنِ رجال کی بہت مشہور کتاب مانی جاتی ہے اس کے مصنف ابن حجر العسقلانی بھی مصر کے رہنے والے تھے۔

عربی زبان کی توسیع کا یہ عمل مصر تک محدود نہ رہا بل کہ براعظم افریقہ اور بعد ازاں جبرالٹر اور سپین سے ہوتا ہوا فرانس کے وسط تک جا پہنچا۔اگرچہ شمالی افریقہ میں سلطنت فاطمیہ سے پہلے بھی مسلم ریاست قایم تھی جو بغداد کی خلافت کو تسلیم کرتی تھی اور یہاں تک کہ جمعے کے خطبے میں عباسی خلیفہ کا نام پڑھا جاتا تھا لیکن خلافت فاطمیہ کے قیام کے بعد افریقہ مسلم دنیا کی تیسری بڑی ریاست بن گیا جس کا دارالحکومت شمالی افریقہ کا شہر قیروان تھا۔فاطمیوں کے عہد میں مسلمانوں کی بحری قوت کا یہ عالم تھا کہ بقول علامہ اقبالؒ :

''بحر بازی گاہ تھا اُن کے سفینوں کا کبھی[23]

سسلی اور اٹلی کا جنوبی حصہ ان کے مقبوضات میں شامل تھا۔بقول ثروت صولت :

"فاطمی بیڑے جنیوا، روم اور نیپلز پر حملے کرتے رہتے تھے اور یورپ کے بحری بیڑے ان کے مقابلے میں ٹھہر نہیں سکتے تھے"[24]

اُندُلس میں عربی زبان کو جو قبولِ عام کا درجہ حاصل ہوا اس کی دیگر وجوہات کے علاوہ ایک بڑی وجہ مذہبی تعلیمات سے واقفیت حاصل کرنا تھا۔ علامہ نیاز فتح پوری کے مطابق اُندُلس کے نظامِ تعلیم میں قرآن کے ساتھ ساتھ صرف و نحو اور عربی زبان سکھانے کی غرض سے فنِ شعر کو ابتدائی درجے کی تعلیم میں بڑی اہمیت حاصل تھی جس کے نتیجے میں "مسلمانانِ اُندُلس کی اکثریت لکھنے پڑھنے سے واقف ہو گئی تھی جبکہ یورپ اس وقت جاہلِ محض تھا۔[25] مولانا عبدالسلام ندوی یورپ تک عربی زبان کے پھیلاؤ کا ایک اور سبب بیان کرتے ہوے لکھتے ہیں:

"اسلامی اسپین کی علمی زبان عربی تھی اس لیے وہاں عربی زبان سے کسی دوسری زبان میں ترجمہ کرنے کی ضرورت نہ تھی بل کہ وہاں یہودی بھی عربی زبان میں تصنیف و تالیف کرتے تھے۔[26]

اس امر کی تائید علامہ نیاز فتح پوری کے مضمون "حکومتِ اندلسیہ" سے بھی ملتی ہے جس میں آپ علامہ مقریزی کے حوالے سے اندلس کے شہریوں میں علمی جوش و خروش کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مقریزی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت عورتوں کو بھی تعلیم کی آزادی حاصل تھی۔ اونچے درجے کی تعلیم میں دینیات، علم الکیمیا، جغرافیہ، فلسفہ، تاریخ، لغت، قواعد اور فنِ شعر شامل تھے۔ اس تعلیم کے لیے متعدد یونی ورسٹیاں قایم تھیں جن میں جامعاتِ قرطبہ، اشبیلیہ، ملاغا اور غرناطہ بہت مشہور تھیں اور ہزاروں طلبہ یہاں تعلیم پاتے تھے"[27]

ابنِ طفیل (طبیب، ریاضی دان اور فلسفی) کی عربی زبان میں فلسفے کے موضوع پر لکھی گئی کتاب "حیّ ابن یقظان" کا ترجمہ لاطینی، روسی، ہسپانوی اور انگریزی کے علاوہ یورپ کی اکثر زبانوں میں ہوا ہے۔[28] امامِ فلسفہ و منطق، علمِ فلکیات کے ماہر، طبیبِ حاذق اور عظیم ریاضی دان ابنِ رشد کو، جنھیں بقول پروفیسر میاں محمد شریف یورپ میں 'اوی روس'، 'اون روئس'، 'ابنِ روتھ'، 'لائیو رائس'، 'بن رائسٹ'، 'عمبوسی اس'، 'ماوی ٹی اَس' وغیرہ کے ناموں سے جانا جاتا ہے، کئی صدیوں تک یورپ کا 'معلم اعلیٰ' ہونے کا اعزاز حاصل رہا ہے۔ یہاں یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ مصر ہو یا مراکش، عراق ہو یا شام، الجزائر ہو یا سپین ان تمام ممالک کا عربی سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا لیکن قرآن و حدیث کی محبت نے انھیں عربی سیکھنے پر مجبور کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ عربی آج بھی اندلس کے سوا بیش تر مذکورہ علاقوں کی First Language کا درجہ رکھتی ہے۔

@ 2021 by the author, this article is an open access article distributed Under the terms and conditions of the Creative Commons Attribution CC-BY http://creativecommons.org/licenses/by/4.0/

[1]ڈاکٹر سید محی الدین قادری، **ہندُستانی کا ارتقا**(حیدر آباد: ادارہ ادبیات اردو، س۔ن)،۱۔

Dr Sayyed Mohiuddin Qadri, *Hindustani Ka Irtiqa* (Hyderabad: Idara Adabiyat-e- Urdu, n.d.), 1.

[2]شبلی نعمانی، **المامون**(اعظم گڑھ: دارالمصنفین۱۸۸۹ء)،۱۰۔

Shibli Nomani, *Al-Mamoon* (Azam garh: Darul Musannefin, 1889), 10.

[3]https://ur.m.wikipedia.org accessed 23 January 2021.

[4]جان بیمز، **ہندوستانی لسانیات کا خاکہ**، مترجم: سید احتشام حسین(لکھنؤ: دانش محل،۱۹۷۱ء)،۱۵۔

John Bames, *Hindustani Lisaniyat ka Khaka*, trans. Syed Ehtisham Hussain (Lucknow: Danish mehal, 1971), 15.

[5]ایضاً، ص:۱۶۔

Ibid., 16.

[6]ابنِ حنیف، **دنیا کا قدیم ترین ادب**(ملتان: بیکن بکس،۱۹۹۸ء)،۲:۲۸۱۔

Ibn e Hanif, *Duniya ka Qadeem Tareen Adab* (Multan: Beacon books, 1998), 2:281.

[7]ایضاً۔

Ibid.

[8]رابرٹ بریفالٹ، **تشکیلِ انسانیت**، مترجم، عبدالمجید سالک(لاہور: مجلس ترقی ادب،۱۹۹۴ء)،۲۲۵۔

Robert Briffault, *Tashkil Insaniyat*, trans. Abdul Majeed Salik (Lahore: Majlis Taraqqi-e-Adab, 1994), 225.

[9]ایضاً،۲۲۷۔

Ibid., 227.

[10]ایضاً،۲۲۶۔

Ibid., 226.

[11]پروفیسر نصیر احمد خاں، **تاریخ زبانِ اردو**(دہلی: کتابی دنیا،۲۰۱۶ء)،۶۴۔

Prof. Naseer Ahmed Khan, *Tarikh e Zuban e Urdu* (Delhi: Kitabi Duniya, 2016), 64.

[12] ابنِ حنیف، **دنیا کا قدیم ترین ادب**،۲:۲۸۴۔

Ibn e Hanif, *Duniya ka Qadeem Tareen Adab*, 2:284.

[13]عنبر بہرائچی، **سنسکرت شاعری**(الٰہ آباد: پہچان پبلی کیشنز،۲۰۰۹ء)،۲۴۔

Amber Bahraichi, *Sanskrit Shairi* (IIāh ābad: Pehchan Publications, 2009), 24.

[14]پروفیسر نصیر احمد خاں، **تاریخ زبانِ اردو**،۶۵۔

Prof. Naseer Ahmed Khan, *Tarikh e Zuban e Urdu*, 65.

[15]عین الحق فرید کوٹی، **اردو زبان کی قدیم تاریخ**(لاہور: اورینٹ ریسرچ سنٹر،۱۹۸۸ء)،۵۴۔

Ain ul Haq fareed koti, *Urdu Zuban ki Qadeem Tareekh* (Lahore: Orient Research Center, 1988), 54.

[16]پروفیسر نصیر احمد خاں، **تاریخِ زبانِ اردو**، ٦٦۔

Professor Naseer Ahmed Khan, *Tarikh e Zuban e Urdu*, 66.

[17]نیاز فتح پوری، **اسلامی حکومتوں میں علوم وفنون کی ترقی (عہد بنی عباس)**، سہ ماہی: نگار ٦٧، نمبر۔١٩٥٥،١ء، ١٩۔

Niaz Fatah Puri, *Islami hukumaton mein Uloom o Funoon ki Taraqqi (Ehad e Bani Abbas)*, Nigaar 67, no. 1(1955), 19.

[18]ایضاً، ٣٥۔

Ibid., 35.

[19]ثروت صولت، **ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ** (لاہور: اسلامک پبلی کیشنز، ١٩٩٣ء)، ١: ٢٣٩۔

Sarwat Solat , *Millat Islamia ki Mukhtasar Tareekh* (Lahore : Islamic Publications, April 1993), 239 : 1

[20]علامہ شبلی نعمانی، **المامون**، ١٢٨۔

Shibli Nomani, *Al-Mamoon*, 128.

[21]مولانا عبدالسلام ندوی، **حکمائے اسلام** (اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ١٩٨٩ء)، ١: ١٠٥۔

Molana Abdussalam Nadvi, *Hukama e Islam* (Islamabad: National Book Foundation, 1989), 1:105.

[22]www.towardsdatascience.com accessed 8 January 2021.

[23]علامہ اقبال، **بانگِ درا** (دہلی: کتب خانہ حمیدیہ، ١٩٩٠ء)، ٩٧۔

Allama Iqbal, *Bang-e-Dara* (Delhi: Kutab Khana Hameedia, 1990), 97.

[24]ثروت صولت، **ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ**، ١: ٢٥٤۔

Sarwat Solat, *Millat Islamia ki Mukhtasar Tareekh* 1:254.

[25]نیاز فتح پوری، **اسلامی حکومتوں میں علوم وفنون کی ترقی (عہد بنی عباس)**، ٢٣۔

Niaz Fatah Puri,*Islami Hukumaton mein Uloom o Funoon ki Taraqqi (Ehad-e-Bani Abbas),* 23.

[26] مولانا عبدالسلام ندوی، **حکمائے اسلام** ٢: ١٥٨۔

Molana Abdussalam Nadvi, *Hukama e Islam*, 2:158.

[27] نیاز فتح پوری، **اسلامی حکومتوں میں علوم وفنون کی ترقی (عہد بنی عباس)**، ٢٣۔

Niaz Fatah Puri, *Islami Hukumaton mein Uloom o Funoon ki Taraqqi (Ehd e Bani Abbas)*, 23.

[28]پروفیسر میاں محمد شریف، **مسلمانوں کے افکار** (لاہور: مجلس ترقی ادب، ٢٠٠٦ء)، ١٣٤۔١٣٥۔

Prof. Mian Muhammad Sharif, *Musalmanon kay Afkar* (Lahore: Majlis-e-Taraqqi-e-Adab, 2006), 135-136.